سرسید احمد خان کے افکار اور مسلمانان ہند

ڈاکٹر اشفاق بخاری

ABSTRACT:

The 19th century Urdu literature was influenced by the Sir Syed Ahmed Khan's Movement and his thoughts in an unprecedented way. His ideas had a miraculous effect on the literary, educational, political and religious arenas. He founded such a center for the Muslims of the sub-continent which opened the possibility to make them enlightened and practical-minded. Through his precious books he inculcated in them a kind of feeling which proved a shining tower for the Muslims of the sub-continent. In the following article an effort has been made to see and lay bare the thoughts of Sir Syed Ahmed Khan in the historical perspective of the Muslims of the sub-continent.

زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ فقط تین سو برس قبل کا قصہ ہے جو عالمی تاریخ میں کوئی طویل مدت نہیں ہے۔ تین سو برس قبل تک عالمِ اسلام اورمسلمانوں کو اس قدر انحطاط کا سامنا نہیں تھا کہ ان کا وجود‘ ان کی تہذیب‘ تمدن معیشت‘ معاشرت‘ سیاست‘ سیادت اور سالمیت معرضِ خطر میں ہو اِس لیے کہ بُنو امیّہ اور بُنو عباس کے دور تک کے دورانیے کو ہم کسیحد تک عروج کا دورانیہ کہہ سکتے ہیں۔ بعد ازاں جب ملت اسلامیہ پرمشکل گھڑی آئی تو منصب و جاہ کے چراغ ٹمٹمانے لگے‘ دربار اجڑنے لگے‘ عاقبت نااندیشی اپنا رنگ دکھانے لگی‘ اغیار نے تعلیم و تحقیق کو اور ہم نے تساہل و تعیش کو اپنا کر خود کو قومی سطح پر آمادۂ زوال کرلیا جبکہیورپی اقوام نے نوآبادیاتی نظام کو فروغ دیا اور اس کی زد میں مسلمانوں کی بستیاں آنے لگیں‘ مسلمانوں میں بے فکری‘ بے بضاعتی‘ بے اختیاری‘ بے عملی اور بے بسیکا چلن معمول بن گیا۔امتِ مسلمہ کے زوال پر آمادہ ہونے پر عمومی سطح پر تو نگاہِ عالم میں بے توجہی غالب رہی لیکن خواب غفلت کے درجے تک نہ پہنچی اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور میں۔ اللہ نے بعض بندے ایسے بھی پیدا کیے جو دامے‘ درمے‘ قدمے اور سخنے ہر اعتبار سے اتھاہ تاریکی میں چراغ جلانے کی مقدور بھرسعی کرتے رہے۔ ان میں جو نام اہم ہیں ان میں اسماعیل پانی پتی کے الفاظ میں:

’’بعض کی مساعی کوباقاعدہ تحاریک کی صورت ملی اور بعض سے قومیں بیدار بھی ہوئیں۔ چند کی مساعی صدا بہ صحرا بھی رہی لیکن مؤرخ نے ان کی بیدار مغزی‘ درست تفکر اور قومی درد کی گواہی دی۔ ان میں بعض نمایاں اسماء امام احمد بن حنبلؒ‘ امام اب تیمیہؒ شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ‘ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ المعروف شیخ احمدسرہندی‘ محمد ابن عبدالوہاب‘ جمال الدین افغانی‘ شیخ محمد عبدہ‘ حسن النباء‘ مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خان کے ہیں۔‘‘ ۱ ؎

سرسید کے یہاں علوم جدیدہ کے حصول کا پرچار ملتا ہے جبکہ دیگر مصلحین علوم اسلامی کے حصول اور ارکان اسلام کی بجا آواری پر زور دیتے ہیں۔ سرسید کی خالص دینی کاوشوں مثلاً ۱۸۴۲ءـــ میں منظرعام پر آنے والی تصنیف ''جلاء القلوب بذکرمحبوب'' جس میں سیرت نگاری ایک عاشق رسولؐ کی طرز پر کی گئی ہے۔ یا ''تحفۂ حسن'' جس میں خالصتاً فروعی مباحث کا ترجمہ ہے یا ۱۸۴۹ءـــ مینشروع ہونے والی تصنیف ''کلمات حق'' جس میں تصوف اور پیر و مرید کے رشتے پر اظہارِ خیال ہے۔ مزید برآں ۱۸۵۰ءـــ شائع ہونے والی تصنیف ''راہ سنت وردِّ بدعت'' جس میں اہتمام سنت اور بدعات سے گریز کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں۱۸۵۲ء میں سامنے آے والی تصنیف ''نامقہ در بیان مسئلہ تصویر شیخ'' بھی فقہی رسالہ کہا جاسکتا ہے' یہی نہیں بلکہ حضرت امام غزلیؒ کی معرکۃ آراء کتاب ''کیمیائے سعادت'' کا اردو ترجمہ جو ۱۸۸۳ء میں ''تصانیف احمدیہ'' میں شامل ہوا' صریحاً مذہبی عنوان ہے۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ شریک طعام ہونے میں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر ''طعامِ اہل کتاب'' تحریر کردی۔

سرسید نے اپنے قیام بجنور کے زمانے میں یعنی ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۷ء میں عیسائی مبلغین کے اسلام مخالف اعتراضات کے رد میں جو مضامین مختلف مواقع پر شائع کیے اس کا مجموعہ ''تبیّن الُکلام'' کی صورت میں مجلے کی شکل میں سامنے آیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت میں بقول مولانا الطاف حسین حالی سرسید نے حکومت سے ملنے والی پنشن کی تمام رقم تک صرف کردی تھی ۲ـــ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں اور دوسرا ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ سرسید کی زندگی کا اہم ترین کام ان کی کتاب ''خطباتِ احمدیہ'' ہے جس مینسیرت نبویؐ پر ۱۲ ابواب یا مضامین شامل ہیں اسی طرح ۱۸۹۲ء میں شائع ہونے والی تصنیف ''تحریر فی الصول تفسیر'' بھی خالصتاً قرآن فہمی اور تفسیرنویسی پر مبنی ہے۔

۱۸۸۹ء میں سرسید نے ایک مختصر کتاب ''ترقیم فی قصہ اصحاف کہف و الرقیم'' کے عنوان سے لکھی جس میں قرآن کی سورۃ الکہف میں اصحاب کہف کے بیان کردہ قصے کی تفاصیل ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں ''ازالۃ الغین الذوالقرنین'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں یاجوج' ماجوج اور حضرت ذوالقرنینؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ موضوع بھی قرآنی ہے۔ ۱۸۹۱ء میں تخلیق انسانی کے حوالے سے قرآنی آیات کا سائنسی بنیاد پر اثبات پیش کیا جو ان کی تصنیف ''خلق الانسان علی ما فی القرآن'' کی صورت میں سامنے آیا پھر اگلے برس یعنی ۱۸۹۲ء میں دعا اور اس کی قبولیت کے حوالے سے ان کا مختصر کتابچہ ''الدعاء والاستجابہ'' شائع ہوا۔ سرسید کا آخری دینی کام ۱۸۹۸ء میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاح کرنے پر عیسائی مشنریوں کے بے بنیاد اعتراضات کا علمی و شافی جواب ہے جو ''ازواج مطہرات'' کے عنوان سے ہے۔

سیداحمد کے خیالات سے علمی اختلاف کا ہر صاحب علم کو حق ہے۔ دین اسلام میں یوں بھی کلام اللہ اور حدیث نبویؐ کے علاوہ ہر شے کو علم الکلام کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں ہر کلام کے حق اور مخالفت میں کلام کی گنجائش ہے۔ لیکن یہ بات اگر اسی صورت میں رہتی تو گوارہ تھی۔ مسلمانان ہند اور بالخصوص دیندار مسلمانوں کا ایک خصوصی حلقہ بھی جو سیداحمد اور ان کی مساعی سے

مکمل طور پر آگاہ نہیں ہے‘ فقط سرسید کے علوم جدیدہ پر اصرار کرنے اور سائنسی اور مقصدی حوالے سے کی جانے والی ان کی ان کاوشوں کے باعث اگر ان سے اختلاف نہیں رکھتا تو انہیں مجدیدین کی صف میں جگہ دینے پر تو بالکل تیار نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی تحریک علی گڑھ کی فکری سمت کے بارے میں بھی تحفظات کا شکار ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس بابت صورت مسئلہ ‘ نوعیت مسئلہ اور غلط فہمی کی بنیاد کو بیان کر کے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائےسید احمد کی دینی تصانیف کا ذکر ہوچکا ہے جس کی بنیاد پران کی تحریک کو فقط مادّی ذرائع حاصل کرنے کی تگ و دو تک محدود قرار دیا جانا بھی از خود باطل ثابت ہوتا ہے۔

دوسری غلط فہمی اس بابت یہ ہے کہ ہم میں سے بعض محدود سوچ رکھنے والوں کے یہاں دینداری میں بھی اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا کہ جو ’’قرآن و حدیث‘‘ ہی فقط دینی ذرائع ہیں اور علم الُکلام میں بعد اازاں لغت‘ صرف‘ نحو‘ منطق‘ فلسفہ و دیگر علوم عقلیہ علم حاصل کرنے کے ذرائع کے طور پر ہیں تو ثابت ہوا کہ علوم دینیہ اور فکر دینی کو اپنے اپنے عہد کے حوالے سے جاننے‘ پھیلانے‘ سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے علم الکلام روز اوّل سے علوم دینیہ کا حصہ ہی نہیں بلکہ جزو لاینفک ہے۔ اب طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اگر ’’ملا نظام الدین‘‘ آج سے پانچ صدی قبل اپنے وقت کے علومِ جدیدہ سے استفادہ کرتے ہوئے اسے ’’درس نظامی‘‘ کے طور پر متعارف کرائیں تو تین صدیوں بعد ہم اسے تو علم دین مانیں‘ لیکن اگر سید احمد افکارِ دیں اور انیسویں صدی میں انہی خطوط پر تحریک علی گڑھ چلائیں اور مسلانوں کو اپنے وقت کی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے انگریزی و سائنس پڑھنے کو کہیں تو یہ اقدام ہماری روایتی سوچ پر بارِگراں ثابت ہوتا ہے اور ہم اس کو علم الکلام میں شامل کرنے کے بجائے اسے درسِ نظامی سے متصادم اور علوم دینیہ سے باہر گردانتے ہیں بلکہ بیک جنبش قلم رد کرتے ہیں۔

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ ہمارے بعض حلقے سرسید کی دینی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ان کی علومِ دینیہ پر ذاتی دسترس سے واقف نہیں ہیں۔ عوام الناس کی اکثریت اس بات سے بے خبر ہے کہ سرسید نے بھی اوائل جوانی تک مسلمانوں کے رواجی مدارس میں ہی تعلیم حاصل کی ہے اور نمایاں کامیابی سے تمام اسباق پڑھے ہیں یہ بات بھی عام طور سے لوگوں کے علم میں نہیں ہے کہ سرسید احمد خان اور مولانا قاسم نانوتوی پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے بیک وقت ایک ہی استاد سے حصولِ فیض کیا جو ’’مولانا مملوک علی خان‘‘ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ غالباً انہیں لاعلمیوں کے باعث لوگ سرسید کو ایسی شخصیت سمجھ لیتے ہیں جو علوم دینیہ اور اوامرِ دینی سے واجبی واقفیت رکھتے تھے۔ البتہ انگریزی عروج نے اور انگریزوں کی ترقی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے تحریک علی گڑھ کی صورت میںانگریزی نظام کو حکومتی کارپرداز عطا کیے۔ اس سطح فکر کے حاملین سے یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ سرسید ایسے مجدد اور زمانے کے وہ نباض تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں کی شکست کے بعد نوشتہ دیوار پڑھ لیا تھا کہ ایک تو انگریزی تسلط ایک ایسی حقیقت کی صورت میں سامنے آیا تھا جس کا انکارِجہالت اور جس کو فی الفور بزور بازو ختم کرنے کی کوشش نادانی تھا اور دوسرے یہ کہ بدلتے ہوئے حالات میں

ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت جو بیرونی حکمرانونکی حکومت کی عادی تھی اور حکمرانوں کی کاسہ لیسی کرنے میں صدیوں کا ریاض رکھتی تھی۔ مسلمانوں کے اقتدار کے عہدِ رفتہ کے باعث انہیں اس زمانے کے حالات کے تناظر میں دیوار سے لگا دینے کے درپے تھی۔ ان سنجیدہ‘ بڑے اور فوری نوعیت کے مسائل کا حل سرسید نے یہ پیش کیا کہ مسلمانوں کو ان علوم و فنون کے حصول پر مائل کیا جو ایک طرف تو اس عہد میں ان کی ترقی‘ بقا اور دفاع کے ذریعہ تھے اور دوسری طرف انہیں علوم پر دسترس رکھنے کے باعث یورپی اقوام دنیا بھری میں کمزور اقوام کو اپنی نوآبادیات میں شامل کررہی تھیں۔ مجدد درحقیقت کہتے ہی اُسے ہیں جو اپنے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے دینی احکامات کی روشنی میں قوم کو مسائل سے نکلنے کا رستہ بتائے۔

ایسے میں کہ جب وقت نے ثابت کیا کہ تحریک علی گڑھ نے ہمیں مولانا الطاف حسین حالی‘ شبلی نعمانی‘ مولوی نذیر احمد ایسی شخصیات دیں جن کی دینداری اور دینی کاوشوں پر جمہور متقدّمین کا اتفاق ہے۔ خصوصاً ایسے میں کہ جب اسی تحریک علی گڑھ نے ہمیں تحریک خلافت دی اور علی برادران ایسی شخصیات عطا کیں۔ خصوصاً ایسے میں کہ جب اسی تحریک علی گڑھ نے ہمیں آل انڈیا مسلم لیگ عطا کی اور مولانا حسرت موہانی‘ مولانا عبدالقادر آزاد‘ راجہ صاحب محمودآباد وغیرہ عطا کئے خصوصاً ایسے میں کہ جب اس اسی تحریک علی گڑھ نے ہمیں پاکستان جیسی نعمت لینے کے قابل بنایا اور خان لیاقت علی خان‘سردارعبدالرب نشتر‘ قاضی فیض عیسٰی اور مختار مسعود جیسی شخصیات ملینجو قیام پاکستان کے بعد بھی اسی مقصدیت‘ قومی درد سے لبریز اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے تادم آخر کوشاں رہے۔

مسلمانانِ پاک و ہند کی ناؤ جب زندگی کے سمندر میں بے سمتی کا شکار تھی تو اس نازک دور میں یہ سرسید ہی کی پرعزم شخصیت کی جدوجہد ہے کہ جس کی بدولت منزلِ مراد نصیب ہوئی اس دور کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نثار ترابی اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں کہ:

’’سرسید احمد خان کی توجہ مختلف شعبوں میں تقسیم تھی۔ امتِ مسلمہ اس وقت جن حالات سے گزر رہی تھی اُن میں توجہ کا اس طرح تقسیم ہونا فطری امر تھا، کیونکہ سیاست، معاشرت، صحافت کو بھی ادب کی طرح ایک مصلح کی ضرورت تھی اور اس صورتِ حال میں سرسید کے علاوہ کون ہوسکتا تھا مگر اس کے باوجود اُردو ادب نے اس درویش صفت ادیب سے اپنے مقاصد حاصل کیے۔ سرسید نہ صرف خود ایک انقلابی رجحان کو فروغ دینے مینکامیاب ہوئے بلکہ مصلحین اور انقلابیوں کا ایک طائفہ بھی تشکیل دیا جس میں شبلی نعمانی، نذیر احمد، مولانا حالی، مولوی ذکاء اللہ اور دیگر شامل تھے۔ یہ تمام ادیب ان مقاصد کی آبیاری کے لیے کام کرتے رہے جو سرسید نے اصلاح قوم کے لیے متعین کیے تھے۔ انہوں نے مختلف شعبۂ ہائے ادب میں انفرادیت اور مہارت پیدا کی اور اپنے متعین شعبوں میں موجدین کا مقام حاصل کیا۔‘‘(۳(

وائے حسرت! اگر نیلسن میڈیلا‘ رنگ کی بنیاد پر ہونے والی ناانصافیوں پر آواز بلند کرنے اور تکالیف برداشت کرے تو اس کی قوم اسے اپنا ہیرو بناتی ہے۔امریکہ میں آج تک جارج واشنگٹن اور ابراہم لنکن کو لوگ اپنے محسنوں کی بہ حیثیت سے یاد رکھتے ہیں۔ چلی کے رہنے والے چی گوریا

کو اب تک تقدس کی علامت سمجھتے ہیں لیکن مسلمانانِ پاک و ہند سرحد کے اس پار ہوں یا اس پار' سرسیداحمدخان کو ابھی تک حیثیت مجموعی اپنی نظروں میں معتبر نہ کرسکے اس کی کوئی وجہ' کوئی مجبوری'کوئی مصلحت' عقل و خرد کے جوازی تقاضونسے ماورا ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ ہم نے عمومی طور پر اس حقیقت سے آشنائی حاصل کرنے کی ضرور ت ہی محسوس نہیں کی جس کی طرف ڈاکٹر سید عبداللہ نے اشارہ کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اُردو ادب پر سرسید احمد خاں کے اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اثر اسلوبِ بیان پر بھی ہوا ' موضوع اور روحِ معانی پر بھی۔ سید صاحب کے اِس اثر و تاثیر کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر عموماً اِس تاثیر و اثر کی داستان یا حقیقت سید صاحب کے احسانات یا خدمات کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ اِس کی تشریح علمی یا فکری لحاظ سے بہت کم کی گئی ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ ہم عموماً اِن بحثوں میں سید صاحب کی سیاسی شخصیت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور اُن کی ادبی اہمیت کو اُن کی سیاسی اہمیت کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ پس ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اُردو ادب میں سید صاحب کی خالص علمی اور ادبی اہمیت اور حیثیت کا جائزہ لیں اور یہی سمجھنے کی کوشش کریں کہ سید صاحب نے اُردو ادب کو حقیقت میں کیا دیا؟''(۴(

حواشی و حوالہ جات

)۱(	اسماعیل پانی پتی، ملاقاتِ سرسید، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۱ء، ص۸۱

)۲(	حالی، حیات جاوید، نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۷۹ء، ص ۱۴۵-۱۴۴

)۳(	نثار ترابی(ڈاکٹر) ''جدید ادب پر سرسید کے اثرات''، مشمولہ آرٹس اینڈلیٹرز، پشاور: اسلامیہ کالج یونی ورسٹی، شمارہ ۱۵، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲

)۴ (سیدعبداللہ(ڈاکٹر)، ''سرسید کا اثر ادبیات اُردو پر''، مشمولہ حیاتِ سرسید، مرتب(ڈاکٹر رخسانہ صبا)، کراچی: انجمن ترقی اُردو اکتوبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۸۷

/....../